''آنگن'' کی فکری ساخت: موضوعاتی مطالعہ

روبینہ کوثر/ڈاکٹر ظفر ہرل

Abstract:

Khadija Mustoor's novel 'ANGAN' is one of the important novels written after Pakistan's came into being. She has discussed war of independence, partition, migration and other political issues in this novel. The political tussle between two big parties of India , Congress and Muslim league have also been discussed in the novel as both parties deeply affected the people of India individually and collectively. In 'ANGAN' Khadija tries to explore the reasons that how social changes affect the individuals in society and how certain civilization retrogrades. The characters of Angaan willingly surrenders to their ideologies but do not leave them.

قیامِ پاکستان کے بعد لکھے جانے والے ناولوں میں خدیجہ مستور کا ناول ''آنگن'' ایک اہم ناول ہے۔ ناول کی کہانی جس عرصہ پر محیط ہے اس میں دوسری جنگِ عظیم، تحریکِ آزادی، برصغیر کی تقسیم اور تقسیم کے بعد کا دور شامل ہے۔ برصغیر کی تاریخ میں یہ پورا دور سیاسی اعتبار سے خاصی اہمیت کا حامل ہے بلکہ اس دوران کئی معاشرتی اور تہذیبی تبدیلیوں کا بھی ظہور ہوا۔ یہ تبدیلیاں افراد پر بھی اثر انداز ہوئیں اور معاشرہ پر بھی۔ کیوں کہ کوئی بھی تبدیلی کسی معاشرہ کی تعلیمی و سیاسی فضا پر براہِ راست اثر انداز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔

خدیجہ مستور نے ''آنگن'' میں ایک متوسط طبقے کی زندگی کی عکاسی کی ہے اور اس کہانی کے ذریعے اس پورے دور کو از سرِ نو زندہ کر دیا ہے۔ نیلم فرزانہ ''اردو ادب کی خواتین ناول نگار'' میں لکھتی ہیں:

> ''خدیجہ مستور نے اپنے ناول میں جنگِ آزادی، تقسیم ہند اور ترکِ وطن جیسے ہنگامی اور سیاسی موضوعات کو ایک فنی جہت عطا کی ہے۔ کانگرس اور مسلم لیگ کی جدوجہد ان کی جانفشانیاں، ان کی دشمنی، سب کچھ فن کارانہ حُسن کے ساتھ اس چھوٹے سے کینوس پر ابھر کر سامنے آ گیا ہے۔''(۱)

☆پی ایچ ڈی سکالر، شعبہ اُردو جی سی یونیورسٹی فیصل آباد
☆☆اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو جی سی یونیورسٹی فیصل آباد

''آنگن'' کو بنیادی طور پر سماجی یا تہذیبی ناول بھی کہا جا سکتا ہے جس میں مصنفہ نے زندگی کے کئی فلسفوں پر قلم اُٹھایا ہے۔ بدلتے ہوئے حالات اور تبدیلی ہر ذی روح کو متاثر کرتی ہے۔ مصنف بھی اسی معاشرہ کا فرد ہوتا ہے اور وہ ان تبدیلیوں سے اپنے دامن کو نہیں بچا سکتا بلکہ یہ تبدیلیاں زیادہ شدت کے ساتھ فن کار یا مصنف پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ کیوں کہ فن کار معاشرہ کا ایک حساس فرد ہوتا ہے اور اس پر دیگر لوگوں کی نسبت کسی بھی واقعہ کا بھی زیادہ شدت سے اثر ہوتا ہے۔ ہندوستان کے بدلتے ہوئے حالات نے بھی وہاں کے عوام کو متاثر کیا۔ یہ سیاسی تبدیلی ہو یا تہذیبی اس نے ہندوستان کی عوام کو اجتماعی اور انفرادی دونوں سطح پر اثر انداز کیا۔ اگر ایک طرف اس سیاسی اور تاریخی پر آشوب واقعات نے ہندوستان کے جاگیر دار طبقے کو متاثر کیا ہے تو دوسری طرف زندگی کے تقاضوں کے زیرِ اثر ہونے والی تبدیلیاں بھی پیدا ہوئیں۔ اس کے نتیجہ میں ہندوستان میں ایک عجیب قسم کی بے چارگی پیدا ہوئی۔ زمیندار طبقے کا زوال ہو گیا۔ یہ زوال ایک تاریخی حقیقت ہے۔ جسے اردو ادب میں متعدد مصنّفین نے اپنے اپنے انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور کسی حد تک اس زوال کے اسباب بھی جاننے کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خان لکھتے ہیں:

> ''خدیجہ کے یہاں وہ سب تکنیکی وفنی صلاحیتیں ملتی ہیں جو اچھے ناول کی تخلیق کا باعث ہوتی ہیں۔ وہ کہانی بیان کرنے پر قدرت رکھتی ہیں۔۔۔ کہانی کسی چھوٹی سی ندی کے بہاؤ کی طرح آگے بڑھتی ہوئی کسی گہرے سمندر میں تبدیل ہو جاتی ہے جو پہلے منظر ہی سے دیکھنے والے کو بے چین کر دیتا ہے۔ اس کے احساس کو جھنجھوڑتا ہے اور زندگی کے فلسفیانہ پہلو کا شعور بخشتا ہوا اختتام تک لے آتا ہے۔''(۲)

ڈاکٹر ممتاز احمد خان کے بقول خدیجہ کی تحریر قاری کے احساس کو جھنجھوڑ کے رکھ دیتی ہے اور ایک عام فرد کے اندر زندگی کے فلسفے کا شعور بھی عطا کرتی ہے۔ خدیجہ مستور نے آنگن میں ایک فیملی ڈرامے کے ذریعے اس معاشرہ کی مخصوص تہذیب کے زوال کی داستان بیان کی ہے۔ اگر دیکھا جائے تو اس تہذیبی زوال کے اسباب دو سطح پر سامنے آتے ہیں۔ خارجی اور داخلی سطح پر۔ کہانی میں خارجی اسباب پس منظر کے طور پر تاریخی اور سیاسی واقعات کے صورت میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اس زوال کا سبب پوری کہانی میں موجود ہے۔ جہاں نئی زندگی کے نئے تقاضوں کو سمجھنا ہوگا اور پرانی روایات نئی روایات کے ساتھ تصادم کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ ناول کے کرداروں میں ایک کرب اور بے چینی موجود ہے جو انھیں کہیں بھی چین نہیں لینے دیتی۔ ناول کے کرداروں کی شخصیتیں ٹوٹی بکھرتی نظر آتی ہیں۔ ڈاکٹر خالد اشرف ''برصغیر میں اردو ناول'' میں لکھتے ہیں:

''خدیجہ مستور کا ناول ''آنگن''، متوسط طبقے کے ایک گھر کی، قومی سیاست کے زیرِ سایہ بدلتی ہوئی اقتصادیات اور نفسیاتی کیفیات کا احاطہ کرتا ہے۔ اس گھر کے باسی تحریک آزادی سے کسی نہ کسی طور پر وابستہ ہیں۔ اس لیے گھر کا آنگن ہر وقت مخالف سیاسی نظریات کا اکھاڑا بنا رہتا ہے۔''(۳)

''آنگن'' میں خدیجہ مستور نے اس متوسط طبقے کے مسلم گھرانے کے تحریک آزادی کے پس منظر میں پیدا ہونے والے معاشرتی، معاشی، تہذیبی اور جذباتی مسائل کی عکاسی کی ہے۔ اس گھرانے کا شمار کبھی کھاتے پیتے جاگیردار گھرانے میں ہوتا تھا لیکن سیاسی و تہذیبی زوال کی بدولت اس جیسے نہ جانے کتنے گھرانے تھے جو خستہ حالی کی منہ بولتی تصویر تھے، اور جیسے تیسے زندگی کا بوجھ اٹھائے ہوئے تھے اور اپنی جھوٹی انا اور بھرم کی خاطر زندگی گزارنے پر مجبور تھے۔ ''آنگن'' میں اس گھرانے کے افراد مختلف سیاسی نظریات سے وابستہ ہیں۔ کوئی کانگرس کا حامی ہے تو کوئی مسلم لیگ کی حمایت میں آواز اٹھاتا ہے۔ کوئی انگریزوں کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہے تو کوئی شدید نفرت کرتا ہے۔ خدیجہ مستور نے ان سیاسی رجحانات کے نظریات کو بہت خوب صورت انداز میں پیش کیا ہے۔ نیلم فرزانہ لکھتی ہیں:

''اس دور میں آزادی کا مطالبہ، کانگرس اور مسلم لیگ کے نظریات اتنے عام ہو چکے تھے کہ ہر چھوٹا بڑا ان سے متاثر نظر آتا تھا۔ چھمی اور اس کے ساتھ محلے کے بچوں کی حرکات وسکنات اس جانب اشارہ کرتی ہیں۔ اس سیاسی پس منظر کو پیش کرنے سے ناول نگار کا مقصد سیاست کی تصویر پیش کرنا نہیں بلکہ یہ دکھاتا ہے کہ اس عام سیاسی فضا نے عوام کی زندگی کو کس انداز میں متاثر کیا۔''(۴)

کسی بھی فرد کا نظریۂ حیات تبدیل ہو کر کب فلسفہ حیات اور کب فلسفہ معاشرہ بن جائے اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کیوں کہ اس معاشرہ میں ہر فرد کی سوچ الگ ہے اور وہ اپنی سوچ کا مالک ہے۔ اس سوچ میں تبدیلی لانا بہت حد تک ناممکن سی بات ہے۔ یہی سوچ پھر اس کا نظریہ اور اس کے بعد فلسفہ بن جاتی ہے۔

''آنگن'' کے کردار بھی اپنا اپنا فلسفہ رکھتے ہیں اور اسی فلسفے کے ذریعے معاشرے میں تبدیلی لانا چاہتے ہیں۔ ''آنگن'' میں بڑے چچا اور ان کے بیٹے جمیل ملک کی آزادی کے لیے سیاسی جدوجہد میں حصہ لیتے ہیں اور اپنی اپنی سوچ کے تحت سیاسی پارٹیوں کا انتخاب کرتے ہیں۔ بڑے چچا کٹر کانگرسی ہیں جب کہ جمیل مسلم لیگی۔ ان کرداروں کی سیاسی جدوجہد اور عوام کا جوش وخروش ناول میں اس حقیقت کو عیاں کرتا ہے کہ اس دور میں ہر فرد تحریک آزادی کے لیے کوشاں ہے اور اپنے اپنے نظریات و فلسفہ کے مطابق سرگرم نظر آتا ہے۔ ناول میں بڑے چچا اور ان افراد کی نمائندگی کرتے ہیں جو اپنے نظریہ حیات کے حصول کے لیے اپنی اولاد کی تمام تر ذمہ داریاں اور گھریلو مسائل کو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ انھیں

اپنی اولاد کے مستقبل کی بھی فکر نہیں ہوتی اور اس فلسفہ کے حصول کے لیے اپنی جان تک قربان کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔ صرف اس امید پہ کہ آزادی کے چراغ ان کے آنگن میں بھی روشنی بکھیریں گے۔ آزادی کی خاطر وہ کئی بار جیل جا چکے ہیں لیکن انھیں نہ اپنے جیل جانے کا دکھ ہے، نہ بچوں کے مستقبل تباہ ہونے کا غم، لیکن آزادی ملتے ہی ہندو مسلم فسادات شروع ہو جاتے ہیں اور فرقہ ورانہ منافرت کی ایسی آندھی چلتی ہے جو سب کچھ اپنے ساتھ بہا کر لے جاتی ہے اور بڑے چچا جیسے لوگ اپنے آپ کو بے بس و لاچار محسوس کرتے ہیں۔

> ''وہ بھی زمانہ تھا جب ہندو اپنے گاؤں کے مسلمانوں پر آنچ آتے دیکھتے تو سر دھڑ کی بازی لگا دیتے اور مسلمان ہندو کی عزت بچانے کے لیے اپنی جان نچھاور کر دیتا۔ ایسا بھائی چارہ تھا کہ لگتا ایک ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے ہیں۔ پر اب کیا رہ گیا دونوں کے ہاتھ میں خنجر آ گیا ہے۔''(۵)

بڑے چچا اور جمیل کی سیاسی سرگرمیوں نے ''آنگن'' میں ایک مستقل نظریاتی اختلاف کی فضا کو جنم دیا ہے۔ وہیں بڑھتی ہوئی مہنگائی اور افلاس نے اس گھر کا راستہ دیکھ لیا ہے اور روز بہ روز حالات کی بہتری کی بجائے حالات بگڑتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جب طبقاتی نظام کو ختم ہونے کی بجائے اس میں مزید اضافہ کیا گیا۔ عورتوں کے حقوق مردوں سے کم ہیں لیکن عورت کو آواز اٹھانے کی بھی جرأت نہیں دی جاتی۔ عورت داشتہ کے طور پر معاشرہ میں موجود ہے لیکن اُسے قانونی وشرعی کوئی حقوق حاصل نہیں اور اس سے پیدا ہونے والی اولاد بھی قانوناً کوئی حق نہیں رکھتی۔ ناول میں اسرار میاں ایسے ہی مظلوم اور پسے ہوئے طبقہ کی عکاسی کرتے ہیں جو بڑے مالک کی داشتہ کی اولاد ہونے کے جرم میں تمام عمر ظلم کی چکی میں پستے ہیں لیکن اُف تک نہیں کرتے، ان کی اپنی خواہشات کبھی انھیں سر اٹھانے کے لیے مجبور نہیں کرتیں۔ جاگیردارانہ نظام کی کئی خامیوں پر ناول میں نکتہ چینی کی گئی ہے اور خاموشی سے ایسے کرداروں کے جذبات و احساسات کو بیان کیا گیا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مشینی دور نے جاگیردارانہ رعب و دبدبے اور تہذیب کو کم کر دیا تھا۔ دنیا میں تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ نئی نسل بنیادی حقوق اور جمہوری اداروں سے شناسائی حاصل کر چکی تھی۔ ہر فرد کے اندر کسی نہ کسی صورت میں آزادی کا شعور موجود تھا۔ اس معاشرے میں عورتیں اگر اپنے تحفظ کے لیے احتجاج نہ کر سکتی تو خودکشی ضرور کر لیتی تھیں۔ ''آنگن'' میں یہی کام پہلے کسم کرتی ہے جب وہ معاشرے کی ناانصافیوں کے خلاف آواز نہیں اٹھا سکتی اور پھر تہمینہ۔ اُس کی شادی اُس کی مرضی کے خلاف صفدر کی بجائے جمیل سے کی جا رہی ہے۔ وہ اپنے خوب صورت ہاتھ عالیہ کو دکھاتے ہوئے کہتی ہے:

> ''ان میں مہندی رچے گی۔۔۔۔اور یہ بات بھی ہے کہ اس کی سُرخی سے تمناؤں کے خون کا پتہ چلتا ہے۔''(۶)

صفدر تہمینہ سے شادی نہ ہونے پر کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہو جاتا ہے اور ایک انقلابی کی انڈر گراؤنڈ زندگی گزارتا ہے۔ اس دور میں کانگرس کے حامی اگر قومی آزادی کی بات کرتے تو مسلم لیگ تقسیم ہند کا تقاضا کرتی جب کہ کمیونسٹ پارٹی کا تعلق سماجی انقلاب اور سیاسی و اقتصادی آزادی سے تھا۔ اس دور میں کچھ لوگ انگریزوں کو بھی پسند کرتے۔ ان میں عالیہ کی ماں کا شمار ہوتا ہے۔ اس دور میں صفدر کی طرح کے ہزاروں نوجوان سماجی بے انصافی، بے روزگاری، بھوک اور بیماری کے تحت کمیونسٹ اور انقلابی بن کر جان تک کو قربان کر دیتے۔ ''آنگن'' کے بارے میں عقیل احمد لکھتے ہیں:

> ''آنگن'' کی کہانی گھر کے آنگن سے شروع ہو کر ہندوستانی سماج اور سیاست کے دائرے میں پہنچ جاتی ہے۔ گھر کے آنگن میں مذہب، سیاست، ادب، تعلیمی مسائل جیسے موضوعات زیر گفتگو ہوتے ہیں۔ ناول ماضی اور حال دو حصوں میں منقسم ہے۔ یہ آنگن ایسے خاندان کا آنگن ہے جو پہلے خوش حال تھا لیکن جاگیردارانہ نظام کی شکست و ریخت سے مالی دشواریوں سے دوچار ہو گیا۔''(۷)

''آنگن'' کے افراد مختلف نظریات اور مختلف فلسفہ کے حامل نظر آتے ہیں اور اپنے اپنے آدرش کی خاطر ہر کوئی دوسرے کے فلسفہ کو غلط ثابت کرنے پر تلا ہوا ہے یہاں تک کہ خونی رشتوں کا احترام بھی ختم ہو چکا ہے اور ایک دوسرے کے خلاف آپس میں نفرت کا بیج بو رہے ہیں۔ ایک ہی خاندان کے افراد نظریات و فلسفہ مختلف ہونے کی بنا پر مستقبل میں اپنے لیے الگ الگ راہیں متعین کر لیتے ہیں۔ مصنفہ نے ''آنگن'' میں مشترکہ ہندو مسلم معاشرہ کی بہت خوب عکاسی کی ہے اور اپنی تحریر سے مختلف فکر و فلسفہ پر روشنی ڈالی ہے اور سیاسی کش مکش کو غیر جانبدار ہو کر بیان کیا ہے۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خان ''اردو ناول کے بدلتے تناظر'' میں لکھتے ہیں:

> ''خدیجہ مستور کا کمال یہ ہے کہ سیاسی کش مکش کی کہانی میں انھوں نے مکمل غیر جانبداری کا ثبوت دیا ہے حالانکہ سیاسی پس منظر میں کردار تخلیق ہو کر کہانی کار کو اکثر جانبدار بنا دیتے ہیں لیکن خدیجہ اس بھنور سے نکل گئیں اور یہ دکھانے میں کامیاب ہو گئیں کہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے لوگ جب معاشرے میں تبدیلی چاہتے ہیں تو اس عمل سے ان کے اندرون میں کیا تبدیلیاں ظہور پذیر ہوتی ہیں۔''(۸)

''آنگن'' کا تعلق ایسے کرداروں سے ہیں جو اپنے فکر و فلسفہ کی خاطر ریزہ ریزہ تو ہو جاتے ہیں لیکن اپنے فلسفہ کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ چاہے حالات کتنے ہی مخالف کیوں نہ ہو جائیں۔ ناول میں دوہری کش مکش ہے۔ ایک طرف خارجی پرخطر حالات ہیں، دوسری طرف انھیں بے پناہ مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان کا داخلی انتشار و کرب انھیں کسی پل بھی چین نہیں لینے دیتا اور چاہے وہ یاسیت و محرمیت کا شکار ہوں لیکن امید کا دامن ہاتھ سے چھوڑنے نہیں پاتے۔ ہر کردار ایک خاص آئیڈیل

کا حصول چاہتا ہے۔ یہ آئیڈیل اقتصادی خوش حالی بھی ہوسکتی ہے، سیاسی حالات کی بہتری بھی، آزادی کا حصول بھی، خواہ اس کے لیے تمام قوم فنا ہی کیوں نہ ہوجائے اور کوئی چھوٹی موٹی فکر بھی ہوسکتی ہے۔ خدیجہ مستور کی نظر سیاسی حالات کے علاوہ سماجی حقائق پر بھی ہے۔ انھوں نے یوں دو تہذیبوں کو بڑی خوب صورتی سے ایک دوسرے کے مدِ مقابل لا کھڑا کیا ہے اور ماضی و حال کا بیان کرتے ہوئے مستقبل میں انسان کے رویوں کی بھی نشان دہی کردی ہے اور یہ ان کی فنی وفکری صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خان لکھتے ہیں:

> ''ناول لکھنا ایک بڑا فن ہے۔ اس میں محض تجربے، مشاہدے، فکر و فلسفے ہی کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ کہانی کے بیان کے کرب سے گزرنا ایک مسئلہ ہوتا ہے۔ ''یہاں کیا کہا جائے اور کیسے کہا جائے'' کی تکرار ملتی ہے جو اچھے ناول کو عصری و ابدی صداقتوں کا ترجمان بنا ڈالتی ہے۔ خدیجہ مستور کے یہاں وہ سب تکنیکی وفنی صلاحیتیں ملتی ہیں جو اچھے ناول کی تخلیق کا باعث ہوتی ہیں۔ وہ کہانی بیان کرنے پر قدرت رکھتی ہیں۔''(۹)

کوئی بھی ناول فکر و فلسفہ کے بغیر مکمل ہو ہی نہیں سکتا۔ ہر مصنف کوئی نہ کوئی فلسفہ اپنے فن میں بیان کرتا ہے۔ ناول نگار کو یہ فائدہ ہے کہ اسے اپنے فلسفہ کے اظہار کے لیے زیادہ وسیع کینوس میسر آجاتا ہے۔ مصنف اپنی کہانی کا تانا بانا بنتا ہی اس فلسفہ کے گرد ہے جس کا وہ اظہار کرنا چاہتا ہے۔ خدیجہ مستور نے اپنے ناول آنگن میں جہاں مختلف فکر و فلسفہ کی بات کی ہے وہاں محبت کے فلسفہ پر بھی بار بار اظہار ہوتا ہے:

> ''خدا جانے آپا اتنا کم کیوں بولتی تھیں۔ کیا محبت لوگوں کو گونگا بنا دیتی ہے؟ کیا محبت کا نام الفاظ کی موت ہوتا ہے؟ پھر لوگ اتنی گھٹیا چیز کے پیچھے کیوں بھاگتے ہیں۔''(۱۰)

محبت انسان کو گونگا بناتی ہے یا زبان عطا کرتی ہے۔ یہ ہر ایک کی اپنی سوچ ہے۔ کسی کو تو محبت گل و گلزار کردیتی ہے اور کسی کو نامراد اور یہ عشق لاحاصل ہی رہ جاتی ہے۔ ''آنگن'' میں تہمینہ بھی صفدر سے خاموش محبت کرتی ہے اور جب اسے پانے کا کوئی چارہ نہیں رہتا تو خودکشی جیسا انتہائی قدم اُٹھا لیتی ہے۔ یعنی ایسے افراد ان کے اندر سماج سے ٹکرا کر پاش پاش ہونے کا حوصلہ ہوتا ہے اور وہ انتہائی آخری قدم اٹھانے سے گریز نہیں کرتے۔ تہمینہ کے بعد عالیہ سے جب جمیل اظہارِ محبت کرتا ہے تو وہ اپنی کیفیت ان الفاظ میں بیان کرتی ہیں:

> ''مرد کی فطرت تو پارے کی طرح ہے۔ ذرا سی گرمی ملی اور بڑھ گیا۔ کل چھمی تھی۔ آج وہ منظورِ نظر ہے، پھر کسی اور کی باری ہوگی۔''(۱۱)

محبت کے فلسفہ کے علاوہ اگر دیکھا جائے تو آنگن میں موت کو بار بار دکھایا گیا ہے۔ موت انسانی زندگی کی اٹل حقیقت ہے۔ کسی بھی ذی روح کو اس سے فرار ممکن نہیں۔ مصنفہ نے آنگن میں جا بجا موت کے فلسفہ پر روشنی ڈالی ہے۔ ناول کے کئی کردار عام انسانوں کی طرح ہنستے بستے موت کی آغوش میں چلے

جاتے ہیں۔ مصنفہ نے ''آنگن'' میں پہلے کسم کے کردار کو موت سے ہمکنار ہوتے دکھایا ہے پھر ہنستی کھیلتی تہمینہ موت کو گلے لگا لیتی ہے۔ عالیہ کی دادی جان کا جنازہ اُٹھتا ہے تو ان کی موت پر ہونے والی مختلف رسوم کا بھی ذکر مصنفہ نے ناول میں کیا ہے۔ عالیہ کے ابا اپنی ماں کی وفات پر ان الفاظ میں اظہار کرتے ہیں:

> ''انھوں نے لکھا تھا کہ تصور کی دنیا کو کوئی جیل بند نہیں کر سکتا۔ اس پر کوئی پابندی نہیں لگائی جا سکتی، میں نے اپنی ماں کو کاندھا دیا تھا۔ میں نے انھیں قبر میں اتارا تھا۔۔۔ خیر تم رنج نہ کرنا میری بیٹی۔ تم کو دل شکستہ نہ ہونا چاہیے۔ موت بھی زندگی کی ایک حقیقت ہے۔''(۱۲)

موت انسانی زندگی کی اٹل حقیقت ہے۔ جس سے کسی انسان کو فرار حاصل نہیں۔ آخر پر عالیہ کے ابا بھی جیل ہی میں دم توڑ دیتے ہیں۔ ''آنگن'' کے تمام کردار عجیب کش مکش اور بے چینی کا شکار ہیں۔ ہر کوئی اپنی اپنی فکر کا مالک ہے۔ جمیل کے ابا آزادی کے حصول کے لیے کوشاں ہیں تو جمیل اقتصادی خوش حالی چاہتا ہے۔ جمیل کی اماں کی امیدوں کا واحد مرکز جمیل کی ذات ہے۔ وہ اپنی تمام امیدیں جمیل سے وابستہ کیے ہوئے ہیں۔ ان کا دوسرا بیٹا شکیل گھر سے عدم توجہ اور پیسے کی کمی کے باعث گھر سے بغیر بتائے فرار ہو جاتا ہے۔ کریمن بوا پورے ناول میں ہر جگہ ہر وقت گذشتہ وقت کو یاد کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ ماضی کے بغیر انسان کا حال نامکمل ہے لیکن ماضی میں جی کر حال کو خراب نہیں کیا جا سکتا۔ عالیہ کی اماں بھی ماضی کی یادوں کو اوڑھے بیٹھی ہیں اور کسی نہ کسی طرح اپنا کھویا ہوا مقام و اقتدار حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ مصنفہ لکھتی ہیں:

> ''اقتدار کی آگ کبھی نہیں بجھتی، لاکھ تہذیب جنم لیتی رہے کچھ نہیں بنتا۔ اقتدار سب کچھ جلا کر بھسم کر دیتا ہے۔ اس کے باوجود دعویٰ ہے کہ اب ہم مہذب ہو چکے ہیں۔ سروں کے مینار بنانا اور انسانوں کو پنجروں میں بند کرنا تو صدیوں پرانی وحشت کے دور کی یادگاریں ہیں مگر آج جو جنگ ہو رہی ہے، ایک سے ایک بڑھیا بم لو، جس سے سب سے زیادہ بے گناہ مریں وہ سب سے ترقی یافتہ ہتھیار۔''(۱۳)

صدیوں سے اقتدار کی خاطر انسانیت مرتی آ رہی ہے۔ اقتدار کا حصول انسان کو اندھا کر دیتا ہے اور پھر انسان اقتدار حاصل کرنے کے لیے ہر جائز و ناجائز قدم بھی اٹھا لیتا ہے۔ پھر بھی معاشرے مہذب کہلاتے ہیں۔ اقتدار کی ہوس کی خاطر شہروں پر بم گرائے جاتے ہیں اور انھیں مکمل طور پر تباہ و برباد کر دیا جاتا ہے کہ اگر وہ دوبارہ سر بھی اٹھائیں تو انھیں صدیاں درکار ہوں۔ جاپان میں ہیروشیما پر بمباری کے واقعہ کو مصنفہ نے ان الفاظ میں لکھا ہے:

> ''اللہ یہ حکومتیں شہروں کو کیوں نشانہ بناتی ہیں۔ ان کا کیا قصور، انھیں کیوں موت کے گھاٹ اُتار دیا جاتا ہے۔ مگر یہ تو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔ تاریخ کبھی مسکرائے گی بھی کہ نہیں، ایک ایک لفظ خون کی بوند معلوم ہوتا ہے۔ ہیروشیما کی آگ میں کیا کچھ نہ جل گیا ہوگا۔ پتہ نہیں لوگ اس وقت کس عالم میں ہوں گے۔''(۱۴)

مصنفہ نے بڑی مہارت سے اتنے بڑے واقعہ کو چند لفظوں کے اندر بیان کر کے رکھ دیا ہے اور زندگی وموت، اقتدار و ہوس کا فلسفہ مختلف پیرائیہ میں بیان کر دیا۔ وہ زندگی کی حقیقتوں سے پردہ اٹھاتے ہوئے مختلف فکر وفلسفہ پر بات کرتی ہیں۔ وہ انسان کے دکھ سکھ اور خواب وخیال کی کہانی بیان کرنے میں خاص مہارت رکھتی ہیں۔ خدیجہ مستور کرداروں کی نفسیات سے پردہ اٹھاتی چلی جاتی ہیں اور کہانی میں چھوٹی چھوٹی باتوں سے تانا بانا بنتے بنتے فکر وفلسفہ کی گتھیوں کو سلجھاتی چلی جاتی ہیں۔ خدیجہ مستور کہانی کا آغاز دل چسپ ڈرامے کی طرح کرتی ہیں اور قاری کو مکمل گرفت میں لینے کے بعد ان کے احساس کو جھنجھوڑتے ہوئے زندگی کے فلسفیانہ پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہیں۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خان لکھتے ہیں:

> ''خدیجہ مستور نے ''آنگن'' میں نہ صرف کہانی کے تمام لوازمات ایک اکائی میں پرونے کا کیمیائی عمل انجام دیا ہے بلکہ کسی ملک کی وہ کہانی جو ہنگامہ خیزی اور متعدد بحرانوں سے عبارت تھی اسے انتہائی حسن وسلیقے سے ایک اہم ناول بنا دیا ہے۔ ''آنگن'' پاکستان کی مختصر زندگی میں تخلیق شدہ ناولوں میں سے ایک اہم ناول ہے اور کمتری کے احساس کے بغیر یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ''آنگن'' ترجمے کے بعد دنیا کی مختلف زبانوں میں لکھے گئے اچھے ناولوں کے ساتھ رکھا جا سکتا ہے۔''(۱۵)

بہت کم مصنّفین کے ہاں ایسا ہوتا ہے جب معاشرے کی سچی تصویر پیش کرتے ہوئے مختلف فلسفوں پر بات بھی کی گئی ہو۔ بچے کھچے زوال آمادہ معاشرہ میں سر اٹھا کر جینا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ ''آنگن'' میں عالیہ اور صفدر نے ایک نئے ملک میں پناہ لی۔ جہاں تغیر پسند حالات نے کوئی واضح اور متعین سمت کا تعین نہیں کیا تھا، امیری غریبی اور طبقاتی سماج کی بنیاد پر قائم فرد کی کم تری، برتری اور فرقہ واریت پر مبنی تہذیب کو بیان کرتے ہوئے ناول نگار نے آنگن کو بیان کرتے ہوئے گھر سے باہر پورے ملک میں ہونے والے تغیر کو بڑی مہارت سے بیان کیا ہے۔ حالات کی تبدیلی، سماجی تغیرات کی بھرمار اور پرانے اصولوں کو چھوڑ کر نئے معاشرتی مسائل کا سامنا کرنا، نو تعمیر معاشرہ کے چیدہ چیدہ مسائل ہیں۔

خدیجہ مستور گھر کے آنگن کو بیان کرتے ہوئے دراصل مشترکہ تہذیبی معاشرہ کا عکس بیان کرتی ہیں۔ گو آنگن بظاہر ہندوستان کے ایک متوسط طبقے کے ایک خاندان کی کہانی ہے لیکن اس آنگن میں ہندوستان میں ہونے والی مختلف سیاسی جماعتوں کی سرگرمیوں کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تحریک آزادی کا شور بڑھا تو ہندوستان کا کوئی مسلمان بھی اپنے آپ کو اس شدت سے محفوظ نہ رکھ سکا اور عوامی اضطراب بڑھتے بڑھتے گھر کے آنگن تک پہنچ گیا۔ گھر کا آنگن گاندھی جی، نہرو اور جناح کے نعروں سے گونج اٹھا۔ ان حالات میں بعض لوگ غیر ملکی استبداد کا شکار ہوئے تو بعض ہندوستان کی سیاسی جماعتوں کے اور جو بچے ان میں زندگی کی کش مکش اور اضطرابی کیفیت پائی گئی ان کا زوال اس طرح ہوا کہ یہ افراد اپنے ہی ماحول میں اجنبیوں کی طرح زندگی گزارنے لگے اور بیتے ہوئے وقت کو یاد کر کر کے وقت گزارنے کے سوا

ان کے پاس کوئی چارہ نہ تھا۔ مصنفہ نے گھر کی چار دیواری کے اندر جس آنگن کی عکاسی کی ہے دراصل وہ برصغیر کے ہر گھر کا آنگن بن گیا ہے۔ جب آزادی کی گونج ہر گھر میں پہنچ چکی تھی اور کوئی بھی اپنے آپ کو محفوظ نہ رکھ سکا۔ اسی آنگن میں گھریلو مسائل بھی ہیں اور گھر کے باہر کے مسائل کی جھلک بھی، ان مسائل کے اثرات بھی نمایاں ہیں اور نتائج بھی دکھائی دیتے ہیں۔ گھر سے باہر ہونے والی بحثیں گھر کے آنگن تک پہنچ جاتی ہیں۔ جہاں مصنفہ مذہبیات، سیاسیات، تعلیمی مسائل اور زندگی کے دیگر فلسفوں پر بحث کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ مصنفہ کی دراصل انسانی زندگی کے نشیب وفراز پر نگاہ ہے۔ چونکہ مرکز توجہ گھر کا آنگن ہے اس لیے گھر کے آنگن ہی میں تمام فلسفہ فکر پر بات ہوتی ہیں۔ پورے ناول میں سوگواری کی فضا موجود ہے۔ ناول کا ہر کردار ذہنی کش مکش اور اضطراب کا شکار ہے اور ذہنی کش مکش انھیں کہیں بھی چین نہیں لینے دیتی۔ ناول کا مرکزی کردار تہمینہ اور اس کی بہن عالیہ ایک بے چینی کا شکار ہیں۔ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ انھیں کیا چاہیے؟ سامنے زندگی کا ایک طویل سفر ہے اور انھیں طے کرنا ہے؟ اس طرح کے سوالیہ نشان قارئین کے سامنے بھی ابھرتے ہیں جو یہ طے ہی نہ ہو کہ ان کی سوچ کیا ہے؟ اور وہ کیا کرنا چاہتے ہیں؟ پورے ناول میں تہمینہ اپنے لیے کوئی فیصلہ نہیں کرنے پاتی اور دوہری سوچوں کا شکار ہو کر بے چین ہے۔

''آنگن'' ایسا ناول ہے جو یہ تاثر دیتا ہے۔ تاریخ کے دھارے میں بہتے ہوئے انسان کیا کیا منصوبے بناتا ہے لیکن وقت کے ہاتھوں اس کے تمام منصوبے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ انسان سوچتا کچھ ہے، ہوتا کچھ اور ہے۔ اور کنارے آ لگنے پر انسان سوچوں اور خوابوں کے تمام منظر بدلے ہوئے پا کر حیرت و استعجاب کا شکار ہو جاتا ہے۔ پورے ناول میں شروع سے لے کر آخر تک کرب و اذیت کی کیفیت کہیں زیادہ ہے اور خوشی کا تاثر کہیں کم۔ قیامِ پاکستان کے بعد کے حالات، مشکلات و مسائل کا تذکرہ زیادہ ہے۔ خدیجہ مستور نے اس سرزمین کا نقشہ آنگن میں کھینچا ہے جس کو حاصل کرنے کے لیے لاکھوں کروڑوں انسانوں نے قربانیاں دیں لیکن جو حاصل ہوا وہ خوابوں کے برعکس تھا۔ خدیجہ مستور خود ایک ایسے گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں جو کہ مہاجر گھرانہ تھا۔ اس لیے انھوں نے ایک ایسے مہاجر گھرانے کی مشکلات کو خوب نبھایا ہے۔ خدیجہ مستور نے انسانی نفسیات کے گہرے مسئلوں کو بے حد آسان کر کے بیان کیا ہے۔ غربت، ناانصافی، معاشرتی استحصال کے خلاف جب وہ لکھتی ہیں تو مختلف فلسفہ وفکر اور تصورات زندگی کا خوب اظہار کرتی ہیں۔ ناول بظاہر ایک گھرانے کے آنگن کی داستان ہے لیکن اس کے علاوہ بعض متصادم سماجی رویوں کی بھرپور عکاسی ہے۔ یوں لگتا ہے مصنفہ نے یہ کہانی بیان کرتے ہوئے وہ مکمل طور پر غیر جانبدار رہتی ہیں۔ وہ اس معاشرہ کو بیان کرتی ہیں جن میں آزادی کی خاطر بچہ بچہ اپنا آدرش رکھتا تھا اور اس فلسفہ کی خاطر اپنی جان تک دینے سے دریغ نہ کرتا تھا۔ ''آنگن'' میں وہ ایسی سیاسی کش مکش کو بیان کرتی ہیں۔ جب کوئی بھی اپنے آپ کو اس سے محفوظ نہ رکھ سکا

اور غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے لوگ جب معاشرے میں تبدیلی چاہتے ہیں تو اس تبدیلی سے ان کے اندر تک تبدیلی رونما ہو جاتی ہے۔ ایسے افراد اپنے فکر و فلسفہ کی خاطر ریزہ ریزہ تو ہو جانا پسند کرتے ہیں لیکن اپنے فلسفہ کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ حالات چاہے کتنے ہی ان کے مخالف کیوں نہ ہو جائیں یہ اپنے آدرش کی خاطر جان بھی دینے سے دریغ نہیں کرتے۔ پورے ناول میں تمام کردار دوہری کش مکش کا شکار ہیں۔ ایک طرف خارجی مسائل کی بھرمار ہے تو دوسری طرف بے پناہ مسائل کا سامنا۔ ان کا داخلی انتشار انھیں کسی پل چین نہیں لینے دیتا اور چاہے کتنا ہی زندگی سے مایوس کیوں نہ ہو جائیں۔ امید کا سہارا آخری دم تک قائم رہتا ہے۔ ناول کا ہر کردار ایک خاص فکر و فلسفہ رکھتا ہے اور اس کے حصول کے لیے ہر قسم کے حالات کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہے۔ یہ فلسفہ اقتصادی خوش حالی کا بھی ہو سکتا ہے، سیاسی حالات کی بہتری بھی، آزادی کا حصول بھی خواہ اس کے لیے تمام قوم کو قربان ہی کیوں نہ ہونا پڑے، اور کوئی چھوٹی موٹی فکر بھی آنگن میں انھوں نے دو تہذیبوں مسلم اور ہندو کے مشترکہ ملاپ، مشکلات، رسم و رواج، اقدار و روایات، مذہب و سیاست اور تہذیب و ثقافت پر مختلف فلسفہ و فکر بیان کیے ہیں۔ کسی بھی مشاہدے، تجربے یا فکر فلسفہ کو بیان کرتے ہوئے کہانی کے بیان کے کرب سے گزرنا پڑتا ہے۔ کیا کیا جائے اور کیسے کیا جائے آنگن میں خدیجہ مستور نے اس فن کو خوب نبھایا ہے۔ بے شک وہ کہانی بیان کرنے میں قدرت رکھتی ہیں۔ ڈاکٹر احسن فاروقی نے کہا تھا ''آنگن' روپوں کا انعام نہیں بلکہ دلوں کا انعام حاصل کرنے کے قابل ہے۔

حوالہ جات

۱۔ نیلم فرزانہ، اردو ادب کی خواتین ناول نگار، لاہور: فکشن ہاؤس، ۱۹۹۲ء، ص: ۲۴۰۔۲۳۹

۲۔ ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، اردو ناول کے بدلتے تناظر، لاہور: اردو اکیڈمی پاکستان، ۲۰۰۷ء، ص: ۱۵۵۔۱۵۴

۳۔ خالد اشرف، ڈاکٹر، برصغیر میں اُردو ناول، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۰۵ء، ص: ۲۱۲

۴۔ نیلم فرزانہ، اُردو ادب کی خواتین ناول نگار، ص: ۲۳۹

۵۔ خدیجہ مستور، آنگن، ص: ۳۰۴

۶۔ ایضاً، ص: ۴۱۵

۷۔ عقیل احمد، اُردو ناول اور تقسیم ہند، دہلی: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۷ء، ص: ۹۲

۸۔ ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، اردو ناول کے بدلتے تناظر، ص: ۱۲۰۔۱۱۹

۹۔ ایضاً، ص: ۱۳۱۔۱۳۰

۱۰۔ خدیجہ مستور، آنگن، ص: ۳۸

۱۱۔ ایضاً، ص: ۱۳۷

۱۲۔ ایضاً، ص: ۱۳۲

۱۳۔ ایضاً، ص: ۱۹۳

۱۴۔ ایضاً، ص: ۲۶۶

۱۵۔ ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، اُردو ناول کے بدلتے تناظر، ص: ۱۲۱